دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر (۱)

ڈاکٹر اسرار احمد

قرآنِ حکیم

قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد

بَدْءُ الْاِسلام میں اسلام کی دو عظیم ترین حقیقتیں

قرآنِ حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ

قرآن: منبع و سرچشمۂ ایمان و یقین، اور جہاد: ایمانِ حقیقی کا مظہرِ اتم

واقعہ یہ ہے کہ 'بَدءُ الاسلام' میں دین کی اصل اساسی اور بنیادی حقیقتیں دو ہی تھیں — ایک قرآنِ حکیم جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد کے ضمن میں 'آلۂ انقلاب' کی حیثیت حاصل ہے بقول مولانا حالی ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع عنوان ہے آپؐ کی اس جدوجہد کے مختلف مدارج و مراحل کا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن مجید ہی کی گرج اور کڑک تھی جس نے نیند کے ماتوں کو جگایا اور خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے والوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ "وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝" اور "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝" کی چونکا دینے

© rasailojaraid.com

والی صدائیں اور" اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ " اور" اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝ " کی بیدارکن ندائیں ہی تھیں جنہوں نے پورے عرب میں ہلچل مچادی اور" عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝ " کی کیفیت پیدا کردی۔ بقول مولانا حالی ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی ۔۔۔ عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

پھر ـــ اِسی کی آیات بیّنات تھیں جنہوں نے هُوَ الَّذِىْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝ (الحدید:۹) کے مصداق انسانوں کو شرک، الحاد، مادہ پرستی، حُبِّ عاجلہ، اور حیوانیتِ محضہ کے " ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ " ایسے مہیب اور ہولناک اندھیروں سے نکال کر ایمان اور یقین کی روشنی سے بہرہ ور فرمایا۔ چنانچہ وہ ایک طرف عرفانِ الٰہی اور محبّتِ خداوندی سے سرشار یعنی مست بادۂ الست ہو گئے اور دوسری طرف دنیا و مافیہا ان کی نگاہوں میں مچھر کے پر سے بھی حقیر تر ہو گئے اور وہ کُلّیتہً طالبِ عقبیٰ بن گئے

مزید برآں ـــ وہی تھا جو " مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ " بھی بن کر آیا، اور " شِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ " بھی! چنانچہ اُسی کے ذریعے لوگوں کا تزکیۂ نفس بھی ہوا اور تصفیۂ قلب و تجلیۂ روح بھی! گویا انذار ہو یا تبشیر، تبلیغ ہو یا تذکیر، موعظت ہو یا نصیحت، تعلیم ہو یا تربیت، تزکیہ ہو یا تصفیہ، تجلیہ ہو یا تنویر ـــ الغرض تطہیر ہو یا تعمیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا عمل دعوت و اصلاح قرآن مجید ہی کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک نہ دو پورے چار مقامات پر آنحضورؐ کے منہجِ انقلاب کو جن اساسی اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے ان کا اوّل و آخر خود قرآن مجید ہی ہے۔ بلفظِ الفاظِ قرآنی:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ	سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور
يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے انہیں
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:۲)	کتاب اور حکمت!

قرآن کا کارنامہ، ایک جملے میں بیان کیجیے، تو یہ ہے کہ اس نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا اور توحید، معاد اور رسالت پر یقینِ محکم کی کیفیت

d.com

پیدا کر دی لیکن اِس سے اُس ہمہ گیر تبدیلی کا اندازہ نہیں ہوتا جو قرآنِ حکیم کے بدولت اُن کی زندگیوں میں برپا ہو گئی تھی اِس لیے کہ قرآن نے اُن رضی کا فکر بدلا، سوچ بدلی، نقطۂ نظر بدلا، اقدار بدلیں، عزائم بدلے، اُمنگیں بدلیں، شوق بدلے، دل چسپیاں بدلیں، خوف بدلے، اُمیدیں بدلیں، اخلاق بدلے، کردار بدلے، خلوت بدلی، جلوت بدلی، انفرادیّت بدلی، اجتماعیّت بدلی، دن بدلا، رات بدلی حتیٰ کہ "تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ" کے مصداق آسمان بدلا، زمین بدلی، الغرض پُوری کائنات بدل کر رکھ دی ——— اور اِس پوری تبدیلی کا ذریعہ اور آلہ ہیں قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات! بقول علاّمہ اقبالؒ:

بندۂ مومن زِ آیاتِ خداست ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست!
چوں کہن گردد جہانے در برش ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ می دہد قرآں جہانِ دیگرش!

تبدیلی اگر حقیقی اور واقعی ہو تو اُس کی کوکھ سے لازماً تصادم اور کشمکش جنم لیتے ہیں جن کے مراحل تبدیلی کی نوعیّت اور مقدار کی نسبت سے کم و بیش ہو سکتے ہیں۔ ایمان نے جو تبدیلی صحابہ کرامؓ میں پیدا کی اُس نے جس تصادُم اور کشمکش کو جنم دیا اُس کے جملہ مدارج و مراحل کا جامع عنوان ہے 'جہاد فی سبیل اللہ'۔

اِس تصادُم اور کشمکش کا اوّلین ظہور انسانوں کی اپنی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ 'مجاہدہ مع النفس' کو 'افضل الجہاد' قرار دیا گیا[1]۔ پھر جب ایمان اشخاص کے باطن میں اِس طرح راسخ اور مستولی ہو گیا کہ ریب اور تشکک کے کانٹے نکل گئے تو اب اُسی جہاد و مجاہدہ کا ظہور عالمِ خارجی میں ظالموں، سرکشوں اور خدا کے باغیوں سے کشمکش اور تصادُم کی صورت میں ہوا جس کا مقصد قرار پایا 'تکبیرِ ربّ'[2] یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اس کی حاکمیّت مطلقہ کا

---

[1] آنحضورؐ سے دریافت کیا گیا: "اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ"!

[2] الفاظِ قرآنی کی رُو سے: "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○" (المدّثر: ۳) اور بقول علاّمہ اقبالؒ

یا وُسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل ‏ ‏ ‏ ‏ یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدامست ‏ ‏ ‏ ‏ یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

© rasailojaraid.com

بالفعل قیام و نفاذ تاکہ "اللہ کی مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو!"[ل] ۔۔۔۔۔ اور اس کی آخری منزل ہے "قتال فی سبیل اللہ" جس کا منتہائے مقصود معیّن ہوا ان الفاظ میں کہ :

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ	اور جنگ کرتے رہو ان سے یہاں تک
فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ	کہ "فتنہ" بالکل فرو ہو جائے اور اطاعت
كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال: ۳۹)	کُلّیۃً اللہ ہی کی ہونے لگے!

ایمان و یقین اور جہاد و قتال کا یہی وہ لزومِ باہمی ہے جس کو نہایت واضح اور واشگاف الفاظ میں بیان کیا گیا قرآنِ حکیم کی اس آیۂ مبارکہ میں :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ	مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ
وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا	پر اور اس کے رسولؐ پر پھر شک میں
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ	نہ پڑے اور جہاد کرتے رہے اللہ کی راہ میں
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ	اور کھپاتے رہے اس میں اپنے اموال
هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۔ (الحجرات: ۱۵)	اور اپنی جانیں حقیقت میں یہی ہیں سچے!

واضح رہے کہ اس آیۂ مبارکہ کے اوّل و آخر حصر کا اسلوب بھی ہے اور آیۂ ماقبل میں 'حقیقی ایمان' اور 'قانونی اسلام' کے مابین فرق و امتیاز کا مضمون بھی۔ گویا مومنِ صادق کی جامع و مانع تعریف قرآنِ حکیم کی کسی ایک آیت میں مطلوب ہو تو وہ یہی آیت ہے۔

الغرض قرآن کے اصل حاصل ہیں ایمان اور یقین اور ان کا لازمی نتیجہ ہیں جہاد اور قتال ان میں سے ایمان و یقین اصلاً ایک معنوی حقیقت اور داخلی کیفیت کا نام ہیں، چنانچہ عالمِ خارجی میں اسلام کی دو عظیم ترین اور نمایاں ترین حقیقتیں ہیں قرآن اور جہاد۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایمانِ حقیقی کی مستقل علامتوں (SYMBOLS) کی حیثیت رکھتے ہیں اور مردِ مومن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ تخیل اور تصور میں ابھرتا ہے اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لازمی و لابدی ہیں! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور خلافتِ راشدہ کے دوران اسلام کی نشأۃِ اُولیٰ،

[ل] سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ۔

d.com

یا غلبۂ دینِ حق کا دَورِ اوّل بلا شائبۂ ریب وشک نتیجہ تھا صحابۂ کرامؓ کے تعلّق قرآن اور جذبۂ جہاد کا۔ لیکن یہ بھی ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ جیسے ہی اسلام نے ایک مملکت اور سلطنت کی صورت اختیار کی اِن دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ اور ایسا ہونا ایک حد تک منطقی اور فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو کسی مملکت یا سلطنت میں اوّلین واہم ترین مسئلہ شہریّت کا ہوتا ہے جو ایک خالص قانونی مسئلہ ہے جس میں تمام تر بحث انسان کے 'ظاہر' سے ہوتی ہے، باطن سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا گویا بقول علّامہ اقبال ؒ "بندوں کو گِنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا!" —— مزید برآں اس کا اصل موضوع نظم ونسق اور امن وامان کا ہوتا ہے جس کے اعتبار سے بنیادی اہمیّت قانون اور ضابطے کو حاصل ہوتی ہے نہ مکارمِ اخلاق یا مواعظِ حَسَنہ کو۔ حتّٰی کہ اس اعتبار سے قصاص عفو پر مقدّم ہو جاتا ہے —— اور دوسری طرف سلطنتوں اور مملکتوں کو، خواہ وہ اصُولی اور نظریاتی ہی ہوں اصل سروکار اپنی حفاظت ومدافعت سے ہوتا ہے، اصُولوں اور نظریات کی تبلیغ واشاعت ہوتی بھی ہے تو ثانوی درجے میں اور حکومتوں کی مصلحتوں کے تابع رہ کر!

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دَور میں داخل ہوا تو اصل زور (EMPHASIS) ایمان کے بجائے اسلام پر، یقین کے بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجۃً قرآنِ حکیم کے بھی منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتابِ قانون اور ریکے از ادلّہ اربعہ[1] ہونے کی حیثیت مقدّم اور مرکزِ توجّہ بنتی چلی گئی۔ اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عملداری وسیع ہوتی گئی قرآن مجید تو چار میں کے ایک، کی حیثیت میں پس منظر میں گُم[2] ہوتا چلا گیا اور توجّہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں[3]۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں جو خلا اس طرح پیدا ہوا اُسے پُر کرنے کے لیے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ ومنطق کی آندھیاں آئیں۔ نتیجۃً پورا عالمِ اسلام ارسطو کی منطق اور نوافلاطونی

---

[1] اصول شریعت چار ہیں: قرآن[1]، سُنّتِ رسول[2]، قیاس[3]، اجماع[4] انہیں اَدِلّۂ اَرْبَعہ کہا جاتا ہے۔

[2] حضرت اکبر کا بہت پیارا شعر ہے۔

صَوم ہے ایمان سے، ایمان غائب صَوم گم   قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گُم!

[3] چنانچہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر تو بے شمار تصانیف ملتی ہیں لیکن اصول تفسیر کے موضوع پر چودہ سو سال میں کل دُو رسالے ملتے ہیں ایک امام ابن تیمیہؒ کا رسالہ 'اصُول تفسیر' اور دوسرا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کا رسالہ 'الفوز الکبیر'

© rasailojaraid.com

تصوّف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ فلسفہ و اصولِ اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا[1]! اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ قرآن نہ منبعِ ایمان رہا نہ سرچشمۂ یقین اور نہ مخزنِ اخلاق رہا نہ معدنِ حکمت ——— بلکہ صرف ایک "ایسی کتابِ مقدس" بن کر رہ گیا جس کے الفاظ یا تو حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آسکتے ہیں[2]۔ اور اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ:

لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ (مشکوٰۃ: کتاب العلم)

اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے اور کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے سوائے صورتِ الفاظ کے اور کچھ نہ بچے گا۔

بعینہٖ یہی معاملہ 'جہاد' کے ساتھ بھی ہوا، جب اصل زور ایمان پر نہ رہا بلکہ اسلام پر ہو گیا تو جہاد بھی جو ایمانِ حقیقی کا رُکنِ رکین تھا خود بخود نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ اور ساری توجّہ ارکانِ اسلام پر مرتکز ہوگئی جن کی فہرست میں جہاد سرے سے شامل ہی نہیں ہے، گویا جہاد پر ظلم قرآن سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اس لیے کہ قرآن تو خواہ چار میں کے ایک' کی حیثیت ہی سے سہی بہرحال شریعت کے اصولِ اربعہ میں شامل تو ہے' جہاد تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شامل نہیں بلکہ نظامِ فقہ میں بھی اس کی حیثیت فرضِ عین کی نہیں صرف فرضِ کفایہ کی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جہاد کا تصوّر بھی مسخ ہوگیا اور اس شجرۂ طیّبہ کی شاخوں کو جڑ اور تنے سے جدا کر کے ہر ایک کو مختلف رنگ دے دیا گیا چنانچہ ایک طرف جہاد مع النفس کا رُخ اعمال اور معاملات کی منجدھار سے پرے ہی پرے اذکار و اوراد اور نفسیاتی ریاضتوں اور ورزشوں کی راہِ تیسیر (SHORT-CUT) کے جانب موڑ دیا گیا اور دوسری طرف جہاد کو قتال کے ہم معنیٰ قرار دے کر اس کا مقصد مملکت کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع اور بس چلے تو توسیع کے سوا کچھ نہ رہا۔ رہا شرک و ظلم، کفر و فسق اور زور و منکر کی ہر صورت کے ساتھ مسلسل کشمکش

---

[1] اسی کا مرثیہ کہا مولانا رومؒ نے ان الفاظ میں ؎
چند خوانی حکمتِ یونانیاں — حکمتِ قرآنیہ را ہم بخواں

[2] ایک تیسرا مصرف قرآن کا وہ ہے جو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں بیان کیا: ؎
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست — کہ از یٰسینِ او آساں بمیری

d.com

اور تصادم اور حق و صداقت کے پرچار، نیکی اور راستبازی کی ترویج، کلمۂ توحید کی نشر و اشاعت اور دینِ حق کے غلبہ و اقامت کے لیے پیہم جدّ و جُہد اور اس کے لیے سمع و طاعت کے اصُول پر مبنی نظامِ جماعت کے قیام کا معاملہ ——— گویا فی الجملہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی منظّم سعی جو ہر مومن کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے تو وہ یا تو سرے سے خارج از بحث ہو گئی یا زیادہ سے زیادہ ایک اضافی نیکی قرار پا کر رہ گئی اور اس سے بالا ہی بالا اور ورے ہی ورے اسلام و ایمان اور تقویٰ و احسان کے جملہ مراحل طے پانے لگے!

اللہ! اللہ کوئی فرق سا فرق ہے اور تفاوت سا تفاوت! ع "ببیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بہ کجا!" کے مصداق کُجا وہ کیفیت کہ صحابہ کرامؓ جذبۂ جہاد سے سرشار، بیک زبان، رجزیہ انداز میں یہ شعر پڑھ رہے ہیں :

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

کُجا یہ حال کہ چودھویں صدی ہجری کے ایک "متنبّی" اور اُس کی ذُرّیتِ صلبی و معنوی نے تو جہاد بالسّیف کو باقاعدہ منسوخ ہی قرار دے دیا، مسلمانوں کی عظیم اکثریّت کا حال بھی عملاً کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ع

"کہ رہوارِ یقیں مابصحرائے گماں گُم شد!"

ڈاکٹر اسرار احمد
کی تالیف
استحکامِ پاکستان
اشاعتِ خاص ۳۰ ، ۲۰ روپے
اشاعتِ عام ۱۲/- روپے
قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا براہِ راست درج ذیل پتہ پر لکھیں
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن
فون: ۸۵۲۶۱۱
پاکستان کیوں بنا ——— کیسے بنا
پاکستان کیوں ٹوٹا ——— کیسے ٹوٹا
اب ٹوٹا تو ---------
پاکستان کی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ
اندھیروں میں اُمید کی ایک کرن
لفظ لفظ میں ——— وطن کی محبّت
سطر سطر میں ——— ایمان کی چاشنی
عمل کا پیغام ---------
اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیجئے

افاداتِ فراہیؒ

ترجمہ: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

قرآنِ مجید کا طرزِ استدلال

[ترجمان القرآن علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نادر مضمون جس کا اردو ترجمہ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مولانا عبد اللہ عمادی مرحوم کے عربی رسالہ البیان لکھنؤ میں ۲۹ ربیع الآخر ۱۳۲۶ھ کے شمارہ ۸ (جلد ۵) میں "محاجۃ الوحی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ علامہ کے قیام کراچی کا یہ آخری زمانہ تھا۔ علامہ فراہی کا انتقال ۱۳۴۹ھ میں ہوا اس طرح یہ مضمون انتقال سے کم از کم پچیس سال قبل لکھا گیا تھا۔ مضمون کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ شائد یہ علامہ کی نہایت اہم غیر مطبوعہ اور ناتمام کتاب "حجج القرآن" کی کوئی فصل ہوگی جس کا مسودہ دائرہ حمیدیہ سرائے میر۔ اعظم گڈھ میں محفوظ ہے

ترجمے پر مولانا امانت اللہ اصلاحی نے اپنی مصروفیات اور خرابی صحت کے باوجود بھرپور نظرثانی نہ فرمائی ہوتی تو یہ اشاعت کے قابل نہ ہوتا۔ ہم اسے علی گڑھ (بھارت) کے ششماہی علمی مجلہ "علوم القرآن" کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں]

(۱)

نبی امت کے لیے باپ کی مانند ہوتا ہے۔ وہ امت پر غایت درجہ شفیق اور علم میں سب پر فائق ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ امت کو ایک عام آدمی کی طرح مخاطب نہیں کرتا۔ اور جب قوم اپنی حماقت، تکبر اور ہٹ دھرمی کے سبب اس کی دعوت کا انکار کرتی ہے تو اسے بے حد رنج ہوتا ہے۔ نبی کا حال اس شفیق باپ کی طرح ہوتا ہے جو اپنے مریض بیٹے کو دوا دینا چاہتا ہے اور بیٹا دوا لینے کے بجائے باپ سے بحث کرتا ہے اور اس کی نصیحت پر توجہ نہیں کرتا، باپ کبھی نرمی سے سمجھاتا ہے، اور کبھی طرح دے جاتا ہے، کہ شائد خود باز آجائے، ایک بات کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو باپ بحث و تردید کے دلدادہ مناظرہ باز کی طرح اس بات پر اصرار نہیں کرتا بلکہ اس کے سامنے کوئی اور دلیل پیش کرتا ہے کہ شائد وہ کارگر ہو۔ اگر تمہیں کسی باپ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو کہ وہ کس شفقت و محبت سے اپنے ضدی بیٹے کے ساتھ پیش آتا ہے، یا کسی مصلح کو کہ وہ کیسی ہمدردی اور دلسوزی سے اپنی بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے

توکسی قدر اندازہ ہوگا کہ نبی کا رویہ اپنی امت کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔

(۲)

اگر نبی کی تعلیمات تک عقل کی رسائی ازخود ممکن ہوتی تو انبیاء کی ضرورت نہ تھی، اور اگر اس کی باتیں خلاف عقل اور بعید از عقل ہوتیں تو اولاً اس پر کم عقلوں کے سوا جو کسی معجزہ کو دیکھ کر صرف تقلید میں ایمان لائے ہوں، کوئی ایمان نہ لاتا۔ ثانیاً ان تعلیمات کو بقا اور رسوخ حاصل نہ ہوتا۔ ثالثاً معجزہ پیش کرنے سے قبل نبی قوم کو قصوروار نہ ٹھہراتا۔ لیکن جب واقعہ یہ ہے کہ معجزہ پیش کرنے سے قبل قصوروار ٹھہرایا گیا، اور انبیاء کی تعلیمات پر اصحاب عقل ایمان لائے۔ نیز ان ارباب دانش کے دلوں میں انھیں رسوخ ملا جنھیں تقلید سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تو معلوم ہوا کہ انبیاء کی تعلیمات عقل کو اپیل کرتی تھیں، چنانچہ جب اس کے سامنے پیش کی جاتی تھیں تو ان کو اس طرح قبول کرتی تھی جیسے کسی کا محب وعزیز بھائی کسی دور دراز مقام سے اسے میوے بھیجے اور وہ مزے لے لے کر کھائے، ایمان کی حلاوت بھی ایسی ہی ہوتی ہے جس کا تجربہ ہر مومن کو ہوتا ہے۔

اوپر ہم نے یہ جو کہا کہ عقل کی ازخود رسائی ان تعلیمات تک نہیں ہوسکتی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ رسائی بالکل محال ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ اسباب گمراہی کا ہر طرف دور دورہ ہوتا ہے اس لیے کہ دنیاوی زندگی پر مادی وحسی لذات وشہوات اور مصائب وآلام چھائے ہوتے ہیں، اور جس طرح آسمان اپنے تاروں کے ذریعہ کرۂ زمین کو روشن کرتا ہے، اسی طرح ایک روحانی آسمان اپنے تاروں کے ذریعہ دلوں کو منور کرتا ہے۔

(۳)

جس طرح انبیاء کے دلوں میں قبول وحی کی استعداد ہوتی ہے، اسی طرح ہمارے دلوں میں انبیاء کی تعلیمات کو قبول کرنے کی استعداد ہوتی ہے۔ یہ استعداد دراصل وہ تیز حس ہوتی ہے جس کی اساس محبت اور ہمہ گیر شفقت اور مہربانی پر ہے۔ اسی سے دل دنیا کی آلائشوں سے پاک ہوتا ہے، نعمتوں کا فیضان کرنے والی ذات کی جانب متوجہ ہوتا ہے، اور انسانوں کے لیے شفقت ومحبت کا پیکر بن جاتا ہے۔ کیونکہ اسے نعمتوں کا عرفان حاصل ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں شکر واحسان کے جذبات اس طرح امنڈ آتے ہیں جیسے چھاتی لبریز ہوجائے اور اس سے دودھ پھوٹ پڑے۔ یہی سبب ہے کہ فیاضی اور دریا دلی بلکہ انسانوں سے عشق سب سے زیادہ انبیاء کرام میں ہوتا ہے، اسی طرح ایمان لانے میں سبقت وہ لوگ کرتے ہیں جو سب سے زیادہ رحمدل

© rasailojaraid.com